۱۸۵۷

جن بہادر اولوالعزم مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء کی
جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا،
اور وطن کو آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی
ان کے مفصل حالاتِ حیات۔ اردو زبان میں پہلی
اور یگانہ کتاب

اٹھارہ سو ستاون کے
مجاہد

غلام رسول مہر

نمبر	عنوان	صفحہ
1	جعفر تھانیسری انڈمان بھیجے گئے ۔ میرزا امیر احمد کا ساتھ دینے میں ہوئی	8, 295
2	میرٹھ ۔ میں فرقہ وار تفریقات کا قائل نہیں	10
3	جنرل بخت خان	22/63
4	انقلابیوں نے شکست کھائی	63, 67
5	تاریخی واقعات میں قیاسات یا افسانہ سازیوں کیلئے قطعاً گنجائش نہیں	80
6	مولوی امام بخش ۔	108
7	مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ ۔ میرزا کا عقیدہ	111
8	وہابی ۔ بخت خان ۔ وہابی کا لفظ	166/167
9	مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کا فتویٰ	181, 206
10	مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ اور اسماعیل دہلوی	203
11	پادری فنڈر ۔ عربی فارسی میں مہارت تھی	240
12	علماء کے نزدیک یہ ہنگامہ مذہبی جہاد تھا ۔	244
13	دیوبند نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ۔	250
14	میر صاحب کی تذکرۃ الرشید کی صفائی پیش کرنا ۔ لفظ سرکار	254

۱۸۵۷ کے مجاہد

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

"۱۸۵۷ء کی ترتیب و تسوید شروع کی تھی تو اس کتاب کا خواب و خیال بھی نہ تھا، جسے اب پیش کر رہا ہوں۔ یقیناً بعض ممتاز مجاہدینِ آزادی کے حالات سامنے تھے لیکن یہی تصور کیے بیٹھا تھا کہ عام واقعات کے سلسلے میں وہ حالات بھی آجائیں گے یا ضرورت محسوس ہوگی تو مناسب مقامات پر چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر تکلف ہوگا، اس لیے کہ اصل کتاب اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جداگانہ ہے۔ دونوں میں پیوند کی حیثیت وہی ہوگی جیسے دو مختلف المزاج جنسوں میں امتزاج پیدا کیا جائے۔

بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ افراد و رجال پر الگ کتاب لکھی جائے۔ جن عزیمت دوست اور حمیت پرور شخصیتوں نے اپنی بیش بہا زندگیاں مقصدِ آزادی کے لیے وقف کیں، ان کی ایک بڑی یادگار یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے سوانح مرتب ہو جائیں اور عام لوگ ان سے عزیمت و حمیت کے سبق لیں۔ یہ حقیقت بھی محتاجِ تصریح نہیں کہ سیر و سوانح کے ذریعے سے قوموں کے لیے بصیرت و عظمت کا جو سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے غالباً فراہم نہیں ہو سکتا۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اعتراف نہ کروں کہ مجھ سے پیشتر بھی بعض اصحاب نے اس کام کے سرانجام دہی کی کوشش کی، لیکن اول معلومات کا سرمایہ بہت معمولی تھا۔ دوم انداز ترتیب شخصیتوں کی عظمت کے شایان شان نہ تھا۔ سوم شخصیتوں کے انتخاب میں ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی پر حصر نہ کیا گیا بلکہ بعض ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کر دیا گیا جو یقیناً حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا پا کر انڈیمان پہنچیں، تاہم یہ ابتلاء ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں پیش نہ آئی تھی، بلکہ وہ معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔ مثلاً:

۱۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری یقیناً انڈیمان بھیجے گئے اور وہاں انھوں نے اٹھارہ سال گزار دیے، تاہم یہ سزا سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کو امداد دینے کے سلسلے میں ہوئی تھی نہ کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں۔

۲۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور مولانا عبد الرحیم صادق پوری بھی محولہ بالا "جرم" میں سزایاب ہوئے تھے، نہ کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں شرکت کے باعث۔ اگرچہ مولانا محمد جعفر کے متعلق ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں چند آدمیوں کے ساتھ دلی پہنچے تھے اور چند روز وہاں لڑے نیز مولانا احمد اللہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کچھ مدت نظر بند رہے تھے۔

۳۔ منیر شکوہ آبادی کو بھی یقیناً انڈیمان بھیجا گیا تھا، لیکن انھیں یہ سزا اس لیے ملی تھی کہ مصطفیٰ بیگ نام ایک شخص نے نواب جان طوائف کو قتل کر کے تزویر سے منیر کو الجھایا تھا چنانچہ منیر اپنے طویل قصیدۂ ابتلائیہ میں کہتے ہیں:

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے
کی دغا ان بدگہر نے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

ہے کہیں کہیں فروگذاشتیں محسوس ہوں یا بعض پہلو تشنۂ تکمیل نظر آئیں تاہم اُمید ہے کہ خوانندگان
کرام اس کتاب کو مختلف حیثیتوں سے اپنی نوعیت کا بالکل نیا مرقع پائیں گے۔
یہ اُن بلند ہمت اور اولوالعزم شخصیتوں کے سوانح ہیں جنھوں نے اس دَور میں آزادی کے
لیے جان کی بازی لگائی، جب اصل مقصد کے لیے تحسین و ستائش کا اندازہ بھی عوام کے ذہنوں
میں صورت پذیر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی غرض یہ تھی کہ دنیا کی زبان پر اُن کے کارناموں
کی مدح کے ترانے جاری رہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو جائے اور اجنبی حکومت
کا نقشِ باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ انھوں نے شدید تاریکی میں زندگی کے چراغ
روشن کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اپنا خونِ حیات اس بے پروائی سے بہایا کہ دوسروں
کو شاید اس طرح پانی کے چند چُلّو بہانے میں بھی تکلف ہو۔

ان کے کارناموں پر ایک سَو سال کی مدت گذر چکی ہے۔ ان میں سے بیشتر کے نام بھی غالباً
اکثر اصحاب کو معلوم نہ ہوں۔ انگریزوں نے اقتدار و تسلط بحال ہو جانے کے بعد ان مساکین کی
بے مثال قربانیوں کے مراز نے کا موقع ہی نہ آنے دیا، لیکن خلوص و بے نفسی کا کوئی چھوٹے سے
چھوٹا عمل بھی قدرت ضائع نہیں ہونے دیتی۔ انھوں نے تربیت بڑے عمل کے لیے قدم اٹھایا
تھا اور جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر آج سب کے سامنے ہے۔ حق و انصاف کی میزان
کا فیصلہ یہی ہے کہ انھوں نے جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا تھا اور اسے اپنی زندگی کے لہو سے
سینچا تھا، وہ نوّے سال کے بعد پھل لایا۔ انگریزی حکومت اپنی بے پناہ قاہری کے باوجود مٹ
گئی۔ آج ہر احسان شناس قلب میں ان مجاہدین کی یاد تازہ ہونی چاہیے جو ایک سَو سال پیشتر
انتہائی مشکلات میں اپنا فرض احسن طریق پر بجا لاتے ہوئے خوفناک آزمائشوں کی منزل سے
کامیاب و کامگار گزر گئے۔

میں ادائے فرض کے سلسلے میں فرقہ وار تفریقات کا قائل بھی نہیں اور انھیں پسندیدہ بھی
نہیں سمجھتا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر اور بدرجۂ ممتاز حصہ مسلمانوں

نے لیا، بلاشبہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جوشِ آزادی کی بے گرانی اور قربانیوں کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے لوگ باوجود کثرتِ تعداد ان سے منزلوں پیچھے رہ گئے یہ اس دور میں مسلمانوں کی شانِ، تیار تھی، جب اس ملک پر بے حسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں جس قوم کا حصہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور جس نے عارضی ناکامی کے بعد نقصان بھی سب سے زیادہ اٹھائے کیا یہ امید بے جا سمجھی جائے گی کہ اس جہاد کی یادگار منانے کی سب سے بڑھ کر حق دار قوم وہی ہے!

مسلم ٹاؤن۔ لاہور
۱۰ مارچ ۱۹۵۷ء

ہنری لارنس تمام معاملات کا مالک و مختار تھا۔ وہ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو مہلک طور پر
زخمی ہوا اور مر گیا اس کے بعد محصورین سے بیلی گارد خالی کرا لینا قطعاً مشکل نہ تھا،
کیونکہ وہاں کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

۲۔ جنرل ہیوے لاک نے اواخر جولائی میں فتح کانپور کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی
شروع کی، لیکن پہلی ہی منزل سے اس کے لیے لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔

۳۔ ۴ اگست اور ۱۲ اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی کی، لیکن دونوں مرتبہ
مراجعت ہی پر مجبور ہوا۔

۴۔ ہیوے لاک کی جگہ آؤٹرم مقرر ہوا۔ یہ دونوں اواخر ستمبر میں لکھنؤ پہنچے لیکن نتیجہ
اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یہ لوگ بھی محصورین کے ساتھ محصور ہو گئے۔

۵۔ نومبر میں سر کالن کیمبل نے پیش قدمی کی۔ کامیاب بھی ہوا لیکن کان پور کے حالات
اتنے نازک تھے کہ لکھنؤ کو سنبھالے رکھنے کی ہمت نہ پڑی اور محصورین کو نکال کر واپس
چلا گیا۔

۶۔ فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ فتح ہوا۔

گویا اہلِ لکھنؤ کو کم و بیش نو مہینے کی مہلت مل گئی تھی، لیکن حضرت محل کی کوششوں کے
باوجود کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کاش حضرت محل عورت کی جگہ مرد ہوتی یا اس کے سے اثر و رسوخ اور عزم و
ہمت کا کوئی مرد قیادت کے لیے موجود ہوتا!

فوج کی دل دہی

مختلف لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر مردانگی اور استقامت احمد اللہ
شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ نے دکھائی۔ حضرت محل برابر فوج کا دل بڑھاتی
رہتی تھی۔ ایک جھڑپ میں جنرل بخت خاں کی توپیں چھن گئیں اور اُسے بہت رنج ہوا۔ حضرت
محل نے فرمایا۔ توپوں کے چھن جانے کا رنج نہ کرو، میں تمہیں اور دوں گی۔[1] ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۱۲

"سکین[1] اور کپتان گارڈن[2] کو مشورہ دیا کہ فوراً دتیا چلے جائیں اور اپنے آپ کو وہاں کے راجا کی حفاظت میں دے دیں، لیکن یہ بھی نہ کیا گیا! انجام کار انھیں ہماری فوج، پولیس اور جیل کے ملازموں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[3]"

یہ خط واقعہ قتل سے رانی کی برأت کا روشن ثبوت ہے۔

تین لاکھ کا مطالبہ

کن کیڈ کا بیان ہے کہ قلعے کے تخلیے اور انگریزوں کے قتل سے فراغت کے بعد تمام انقلابی رانی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم دہلی جانا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں خرچ کے لیے تین لاکھ روپے دیں۔ رانی نے جواب دیا کہ میں تین برس ہوئے ریاست سے الگ ہو چکی ہوں میرے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے! یہ جواب درست تھا۔ رانی کے پاس حقیقتہً نقد روپیہ نہ ہو سکتا تھا خصوصاً اس لیے کہ جو پنشن اسے ملتی تھی اس میں سے متوفی راجا کے قرض کے روپے بالاقساط کٹتے جاتے تھے۔ نیز اس واقعے سے ثابت ہے کہ نہ رانی نے انقلابیوں کے کسی فعل میں حصہ لیا تھا اور نہ وہ انھیں اکسانے اور برانگیختہ کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اگر ایسا ہوتا

---

[1] SKENE جھانسی میں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔

[2] GORDON جھانسی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔

[3] کن کیڈ کی کتاب ص ۲۰۲، ۱۳۰۔ خط سے ظاہر ہے کہ مارٹن خود محاصرے کے وقت قلعے میں موجود تھا۔ وہ کس طرح بچ نکلا؟ اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ میرا خیال ہے رانی کے بھیجے ہوئے، بند وقچیوں کو اس لیے باہر بھیج دیا ہوگا کہ انگریز ان پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ تاہم، پی سی کے سوال کی کیا مدد کر سکتی تھی؟ مارٹن کے اس خط کا مرا نہیں مل سکا۔ مگر رانی کا رہتی سوانح نگار لکھتا ہے کہ میں نے خود یہ خط دیکھا تھا جو غالباً دامودر کے بیٹے کے پاس تھا، اور وہ اگرہ بازار، اندور میں رہتا تھا۔ اس کا ذکر ایس۔ این۔ سین نے بھی کیا ہے (۱۸۵۷ء انگریزی ص ۲۷۹، ۲۸۰)

تو انقلابی اس انداز میں روپے کا مطالبہ کیوں کرتے !

تاہم انقلابی ایسے کسی جواب پر مطمئن نہ ہو سکتے تھے کہ رانی کے متبنیٰ دامودر گنگا دھر راؤ رقیب یعنی رام چندر راؤ کا متبنیٰ سداشیو راؤ ریاست کا طلب گار بیٹھا ہے چنانچہ انھوں نے رانی سے کہہ دیا کہ اگر تین لاکھ نہ ملیں گے تو ہم محل کو آگ لگا دیں گے اور سداشیو راؤ کو مسند حکومت پر بٹھا دیں گے۔

رانی کے لیے یہ دھمکی سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ محل کو آگ لگ جاتی تو جو اندوختہ اس کے پاس باقی رہ گیا تھا، وہ بھی جاتا۔ نیز انگریز اگرچہ جھانسی پر قابض ہو چکے تھے، تاہم رانی کو امید تھی کہ ریاست اُسے واپس مل جائے گی۔ اگر سداشیو راؤ مسند نشین ہو جاتا تو رانی کی یہ امید بھی ختم ہو جاتی۔

اعلانِ حکومت

بہر حال اس دھمکی سے متاثر ہو کر اُس نے ایک لاکھ کے جواہرات انقلابیوں کے حوالے کر دیے۔ جواہرات مل گئے تو انھوں نے رانی کی حکومت کا اعلان کر دیا اور منادی ہو گئی: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم رانی لکشمی بائی کا[1]

حقیقت میں وہ دامودر کی مختار و سرپرست تھی، نہ کہ مستقل حکمران۔ یہ امر بطور خاص توجہ کا محتاج ہے کہ رانی نے اپنی حیثیت سے کبھی تجاوز نہ کیا اور دامودر کے حقوق کو کبھی خفیف سا گزند بھی نہ پہنچنے دیا۔ بلکہ وہ جب تک زندہ رہی، اس نے دامودر کو سینے سے لگائے رکھا اگر کوئی بچہ رانی کے بطن سے بھی ہوتا تو اس سے زیادہ پیار اور ماتا کا مرجع ہرگز نہ بن سکتا، جس کے مظاہرے رانی لکشمی بائی نے دامودر کے تعلق میں کیے۔[2]

رانی کی پوزیشن

اب یہاں اس امر پر تھوڑی سی گفتگو کر لینی چاہیے کہ رانی کی پوزیشن کیا تھی؟ ہم نے مانا کہ واقعات قتل کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوتی

---

[1] کن کیڈ ص ۶۰۵ [2] ساورکر ص ۱۱۶

تھی۔ لیکن کیا اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے کہ رانی نے فوجیوں کو سرکشی پر ابھارا یا خود انھیں بطیبِ خاطر کوئی امداد دی؟ کیا اس بات کی کوئی شہادت ملتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف لڑنے پر تلی بیٹھی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اس کے لیے ایک عمدہ موقع بہم پہنچا دیا تھا؟ مستند تاریخی وثیقوں کے مطابق ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔

واقعات کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ ۵ جون کو جھانسی میں ہنگامہ برپا ہوا۔ رانی کا اس ہنگامے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے پاس جو سو پچاس آدمی تھے، وہ کسی ہنگامے کی روک تھام کا فرض انجام نہ دے سکتے تھے۔

۱۔ انگریزوں نے جتنے گواہ مہیا کیے، ان میں سے کسی ایک کا بیان رانی کو کسی بھی درجے میں مجرم ثابت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ان بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل بے قصور تھی۔

۲۔ امان اللہ خاں سپاہی کو وسطِ ہند کا پولٹیکل ایجنٹ رابرٹ ہیملٹن قابلِ اعتماد قرار دیتا ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ سرکشی سے قبل کسی نے رانی سے مشورہ نہ کیا۔ پھر ڈرا دھمکا کر دوسروں کو ساتھ ملایا اور وہ لوگ رانی کے محل کی طرف گئے تو بھری ہوئی توپیں ساتھ لے گئے۔ گویا بزور رانی سے روپے اور آلات و اسلحہ کی مدد حاصل کی۔

۳۔ ۱۲ جون کو سرکشوں نے دہلی کا راستہ لیا۔ اس وقت سے رانی نے انگریزوں کے پاس مفصل اطلاعات بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے ساگر اور بندھیل کھنڈ کے پولٹیکل ایجنٹوں یا آس پاس کے دوسرے ذمہ دار انگریزوں کے پاس رپورٹیں بھیجیں۔ جب اس کے خلاف اوڑچھا کے راجا نے فوج کشی کی تو انگریزوں سے مدد مانگی۔ ایک پولٹیکل ایجنٹ نے اسے لکھ بھی دیا تھا کہ مالیہ وصول کرو، فوج بھرتی کرو اور انتظامی کاروبار جس حد تک ممکن ہو سنبھالے رکھو۔

۴۔ جب رانی کو یقین ہو گیا کہ دشمنوں کی دراندازی سے انگریز اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں اور جھانسی کا نام سنتے ہی ان پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے حالانکہ رنج دہ واقعات کے لیے وہ ذمہ دار نہ تھی تو اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا جو ہر لحاظ سے عزیمت اور غیرت و حمیت کے عین مطابق تھا پھر وہ زندگی کے آخری سانس تک اسی پر چٹان کی طرح جمی رہی۔

حقیقت سے اعراض کیوں؟

حقیقت یہی ہے جو ہم نے صاف صاف عرض کر دی۔ اس کا کوئی پہلو رانی کی عظمت کے منافی نہیں ہمیں نہ افراط کا شکار رہنا چاہیئے اور نہ تفریط کا۔ نہ رانی کو ابتدا ہی سے انگریز دشمنی کا پیکر بنا کر پیش کرنے کے درپے ہونا چاہیئے اور نہ ایک خاص وقت تک انگریزوں سے لڑنے میں تامل کی بنا پر یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ رانی کو جنگ آزادی میں عمل داری کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ ابتدا میں ہرگز لڑنا نہ چاہتی تھی مگر جب اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا تو ایک لمحے کے لیے بھی تذبذب کو راہ نہ دی اور خطرے کے ہر مقام میں سب سے آگے رہی۔ اس عزیمت پر کون فخر نہ کرے گا، اور اس مردانگی کے لیے کس کے دل کی گہرائیوں سے تحسین و آفرین کی لہریں نہ اٹھیں گی!

ضروری نہیں کہ ہر انسان پہلے ہی مرحلے میں تمام حقائق کا صحیح اندازہ کر لے۔ جب اندازہ ہو جائے تو پھر جان و دل سے راہ عمل پر گامزن ہو جانا منافی عظمت نہیں بلکہ بہرحال مستحق تحسین ہے۔ یقیناً رانی بڑی عظیم المرتبت تھی ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں اس کی شانِ علیت کا مقابلہ احمد اللہ شاہ یا شہزادہ فیروز شاہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ مقصد اعلیٰ ہو اور اس کے لیے انسان جان بازی کا نہ محض عہد کر لے بلکہ بے تامل جان دے دے تو کون ہے جس کے دل میں اس قربانی کے لیے انتہائی احترام کا جذبہ پیدا نہ ہو گا؟ رانی نے آزادی کے لیے میدان جنگ میں جان دی۔ کیا یہ برتری اور عظمت کی سب سے بڑی دستاویز نہیں!

انگریزوں سے لڑوں حقیقت یہ ہے کہ اب رانی کے سامنے انگریزوں کے قلع قمع کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ جھانسی سے بے دخل ہو چکی تھی۔ ۲۱ مارچ سے ۴ راپریل تک اپنے بہادروں کو آزادی کے لیے بے دریغ جانیں قربان کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ یا تو اصل مقصد کو پورا کرنے کی آرزومند تھی یعنی انگریزوں کا استیصال یا چاہتی تھی کہ خود بھی میدان جنگ میں جان دے دے۔

تانیتا ٹوپے بھی کالپی ہی آگیا تھا۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ ان کے روبرو پُرجوش تقریر کی۔ پھر تانیتا ٹوپے کو سالار بنا کر ہدایت کی کہ انگریزی فوج کے مقابلے پر نکلے تانیتا فوج لے کر کونچ پہنچا، جو کالپی سے ۴۲ میل کے فاصلے پر جھانسی کی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رانی بھی تانیتا کے ساتھ گئی۔

ہیوروز نے جھانسی کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ۲۰ راپریل کو کالپی کی جانب کوچ کیا۔ ۲ مئی کو اس نے ایسی جنگی چال چلی کہ تانیتا نے شکست کھائی اور رانی کے لیے کونچ میں ٹھہرے رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ پھر کالپی چلی گئی تانیتا والدین سے ملنے کے لیے چرکی پہنچ گیا؎ کالپی میں سخت مقابلہ ہوا لیکن انقلابیوں نے وہاں بھی شکست کھائی اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انقلابی فوج بے ترتیب تھی اور وہ جم کر مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ نیز سالاری اور قیادت کے جوہر سب سے بڑھ کر رانی لکشمی بائی میں موجود تھے لیکن اُسے خودمختاری کے ساتھ جنگ کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔

؎ میلسن کا بیان ہے کہ فوج کے تمام طبقے کونچ کی شکست کا ذمہ دار تانیتا کو ٹھہراتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ جھانسی کے رسالے نے بھی حق استقامت ادا نہ کیا۔ رسالے کے سپاہی یہ عذر کرتے تھے کہ ہمارے لیے رانی کا بچاؤ ہر شے پر مقدم تھا (جلد پنجم ص ۱۲۵) اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں، میرا تاثر یہی ہے کہ تانیتا میدان عمل میں گھبرا جاتا تھا۔

ساورکر کا بیان ہے۔ تانتیا نے اگرچہ ظاہر یہ کیا تھا کہ والدین سے ملنے جا رہا ہوں، لیکن حقیقتاً وہ اس فکر میں تھا کہ اگر کالپی کو خالی کرنا پڑا تو کوئی دوسرا مرکز تیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ گوالیار گیا۔ درباریوں، سرداروں اور دوسرے اکابر سے مل کر انھیں ہم نوا بنایا، پھر راؤ صاحب کے پاس جا کر گوالیار پہنچنے کی تجویز پیش کی:

"۲۰ مئی کو انقلابی محل پہنچے۔ محل کے کارداروں نے انھیں روکنا چاہا۔ انقلابیوں نے جواب دیا تم روکنے والے کون ہو؟ ہم پیشوا کے نمائندے ہیں۔ ہم سوراج اور سودھرم کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اہل دنیا کو جان لینا چاہیے کہ ہم پیشوا ہیں۔ ہماری جنگ سوراج اور سودھرم کے لیے ہے"[1]۔

جنگ مرار

انگریزی فوج تو کالپی کے بعد مطمئن ہو گئی تھی کہ اب زیادہ لڑائی بھڑائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن جب سنا کہ انقلابی گوالیار پر قابض ہو چکے ہیں تو ہیو روز خود کالپی سے چلا۔ بریگیڈیر سمتھ کو، جو چندیری کے قریب تھا، حکم بھیجا کہ جلد سے جلد کوٹہ کی سرائے پہنچو، جو گوالیار سے پانچ میل جنوب میں ہے۔ ۱۶ جون کو رابرٹ نیپیئر بھی ہیو روز سے آ ملا۔ یہی وہ جرنیل ہے جس نے بعد ازاں وسطی ہند میں انقلابیوں سے لڑائیاں کیں، اسی نے تانتیا کو گرفتار کیا تھا۔ اسے بعد ازاں لارڈ نیپیئر آف مگڈالا کا خطاب ملا۔

سندھیا کے آدمی ہیو روز کی رہبری کر رہے تھے۔ وہ مرار پہنچے تو اچانک اس پر گولے اور گولیوں کی بے وقفہ بارش شروع ہو گئی، تاہم تھوڑی دیر میں مرار کی انقلابی فوج نے شکست کھائی۔ ہیو روز اس میدان میں بھی کامیاب رہا۔

---

[1] ساورکر ص ۳۰۹۔ فارسٹ نے لکھا ہے کہ امام یار کا نائب کوتوال جھوری کا باشندہ تھا۔ جو نانا صاحب اور پیشوا کی مادر کا وطن تھا۔ وہ بھی گوالیار میں رہتا تھا۔ نائب کوتوال نے ہر حال، امداد و اعانت کی تیاری کی تھی۔

آخری رسوم

اب رانی کے آخری سانس تھے۔ اس کا وفادار ملازم رام چندر راؤ دیش مکھ قریب ہی تھا۔ وہ اس شیر دل مجاہدۂ آزادی کو اٹھا کر پاس کی جھونپڑی میں لے گیا۔

گنگا داس بابا نے پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈا پانی پلایا اور بستر کا انتظام کر دیا۔ یہ جنگ کی دیوی خون میں نہائی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گیا۔ رانی نے مرتے وقت جو ہدایات کی تھیں، ان کے مطابق رام چندر راؤ نے دشمن کی نگاہوں سے بچ بچا کر گھاس کا انبار فراہم کیا، اس پر رانی کی ارتھی رکھی۔ رانی کا مردہ جسم آگ کی نذر ہو گیا۔[1]

تانتیا نے گرفتاری کے بعد اپنے سوانح کے متعلق جو یادداشت تیار کی تھی اس میں لکھا تھا کہ رانی کی ارتھی رام راؤ گوبند نے جلائی تھی۔[2]

ملازم کی زبانی

فارسٹ لکھتا ہے کہ رانی کی وفات کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں لیکن اس کے ملازم کا بیان زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہ ذیل میں درج ہے!

رانی کا معمول تھا کہ مردانہ لباس پہن کر فوجوں کی قیادت کرتی۔ سُرخ کرتہ، سُرخ پتلون اور سفید پگڑی۔ اس لباس میں کوئی شخص اس کی صنف نہ پہچان سکتا۔ اس کے متوفی شوہر کی ایک خواص بھی ایسی فوج کے لباس میں ہر لمحہ ساتھ رہتی تھی۔ وہ دونوں (رانی اور خواص) پھول باغ کے دمدمے کے پاس بیٹھی ہوئی شربت پی رہی تھیں۔ بے قاعدہ پلٹن کے چار سو آدمی قریب ہی بیٹھے تھے۔ اس وقت

---

[1] ساہد کر ص ۲۹۰، بیان قابل رانی کے ریش سوانح نگاری کتب پر مبنی ہے۔ جس نے واقعات کی خود بچشم دید کی تھی۔

[2] سیل ص جلد ہجم ص ۲۰۰ (ضمیمہ ب)

خطرے کا بگل بجا کر انگریزی فوج کے مسلح سوار آ پہنچے۔ وہ چالیس پچاس ہوں گے
"باغی" بھاگ نکلے۔ صرف پندرہ کے قریب اپنی جگہ جمے رہے۔ رانی گھوڑے پر
سوار ہوئی۔ اس کے گھوڑے نے نہر کود جانے میں تامل کیا۔ اس وقت رانی کے
پہلو میں گولی لگی۔ پھر سر پر ایک زخم آیا۔ لیکن وہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی
دیر میں دم نکل گیا اور گر پڑی۔ اور پاس ہی کے ایک باغ میں اس کی ارتھی جلائی گئی
اس وقت برہمنی خادمہ کے چہرے پر بھی تلوار کا زخم آیا لیکن شہر تک پہنچ گئی۔ ایک
فقیر اور مسلمان کوتوال نے اس کی تیمارداری کی۔ انہیں ہاتھوں میں وہ مری۔ بعد
ز مسلمہ کی حیثیت میں اسے دفن کیا گیا[1]

ڈاکٹر سین ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ رانی کے گولی لگی۔ تاہم وہ ۔ راؤ صاحب بھی پاس
تھے۔ بیس منٹ بعد اس نے وفات پائی۔ اسے ٹھاکر پھول باغ کی طرف
لے گئے۔ راؤ صاحب پاس تھے۔ پھر لاش کو پالکی میں لٹایا تھا۔ پھول باغ کے درمیان جو
ندی ہے اس پر لے گئے۔ وہاں با اطمینان آخری رسم ادا کرنا ممکن نظر نہ آیا تو لاش کو اٹھا کر
دیوار پر سے باغ کے اندر پہنچایا اور ایک درخت کے نیچے جلانے کا انتظام کیا۔ ابھی رسم ختم
نہ ہوئی تھی کہ انگریزی فوج کا حملہ ہو گیا۔ جو لوگ رسم چھوڑ کر بھاگے ان میں سے چھ سات مارے
گئے۔ بہر حال لاش جل چکی تھی لیکن پھول چنے نہ گئے تھے[2]

رانی کی شخصیت رانی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کشیدہ قامت، نہایت حسین و جمیل
حد درجہ سرگرم و مستعد، خود دار اور دھن کی پکی تھی۔ جھانسی سے
گوالیار تک پیہم دوڑ کر جتنی لڑائیاں پیش آئیں، قریباً ان سب میں رانی سے مقابلہ ہوا۔ لہٰذا

---

[1] فارسٹ جلد سوم ص ۲۰۱ - ۲۰۵ ہومز نے بھی لکھا ہے کہ رانی کی وفات قرابین کی گولی لگنے سے ہوئی تھی

[2] ایضاً ص ۲۰۵

غور طلب امور

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں عظیم اللہ خاں نے اس انگریزی گھرانے میں سیکھیں، جہاں وہ ادنیٰ حیثیت میں ملازم ہوا تھا۔ پھر سکول میں داخل ہوا اور معلم بنا۔ انگریزی کا سیکھنا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن فرانسیسی کس ذریعے سے سیکھی اور کیوں کر اس میں کمال پیدا کیا؟ کیا اس انگریز گھرانے میں فرانسیسی بھی بولی جاتی تھی یا کیا گورنمنٹ ہائی سکول کانپور میں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی!

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کو فرانسیسی سے کیوں دلچسپی ہوئی جبکہ اس زبان میں مہارت پیدا کر لینے سے اُسے اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکتی تھی!

ہمارے سامنے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ تاہم یہ واقعہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کا حافظہ بڑا ہی غیر معمولی ہوگا اور اُسے قدرت نے اخذ و فہم کی خاص صلاحیت عطا کی ہوگی کہ خانساماں یا باورچی کی حیثیت میں مالکوں سے جو کچھ سنتا رہا، وہ ٹھیک ٹھیک اس کے ذہن نشین ہوتا رہا۔

انگلستان اور فرانس کے سفر میں عظیم اللہ خاں کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اسے دیکھ کر عورتیں بے حد متاثر ہوتی تھیں۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جس انگریز گھرانے میں اس نے ملازمت اختیار کی تھی، وہاں بھی کوئی ایسا ہی ذریعہ انگریزی اور فرانسیسی سیکھنے کا باعث بن گیا؟ ان سوالوں کا جواب قیاسات ہی کی بنا پر دیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ واقعات کا مجموعہ اور حقائق کا ذخیرہ ہے، اس میں قیاسات یا افسانہ بافیوں کے لیے قطعاً گنجائش نہیں۔

نانا سے تعلق

انتظام اللہ خاں شہابی فرماتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں ذہین و تیز طبع تھا انگریزی زبان میں مہارت کے متعلق اسے اتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ گورنر کانپور آتے تو ان کے لیے سپاسنامہ عظیم اللہ خاں ہی سے تیار کرایا جاتا۔ اس وجہ سے مقامی حکام میں بھی اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور جب نانا راؤ کو ایک اچھے

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۵ء سے کئی سال پیشتر بمقام لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہتے تھے۔[1]

ثاقب فرماتے ہیں:-

ہوئے شاہ حضرت کے انعام سے ۔۔۔ رہے تھوڑے دن عیش و آرام سے

سفر کی وہاں سے بھی رخصت ملی ۔۔۔ پئے جنگ دپیکار اجازت ملی!

چلے کر کشش و جستجو کی طرف ۔۔۔ گئے بلدۂ لکھنؤ کی طرف

سفر لکھنؤ

لکھنؤ کا سفر اختیار کیا تو مریدین کی ایک جماعت بھی احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھی بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ آپ کانپور میں عظیم اللہ خاں سے بھی ملے اور کچھ مدت وہاں ٹھہرے رہے۔

۲۔ کانپور سے اناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے اور گھسیاری منڈی میں قیام کیا۔

۳۔ اس زمانے میں مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ میں سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے بھی شاہ صاحب سے ملاقات کی۔ خدا جانے شاہ صاحب نے کیا کہا کہ مولانا لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ کر الور چلے گئے۔

ثاقب نے لکھا:

نصاریٰ سے جو حکم پیکار تھا!
ہر اک شخص سے اس کا اظہار تھا

---

[1] ہجرت [illegible] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۳ مولوی سید امیر علی مرحوم فیض آباد کو [illegible] سے لکھنؤ چھوڑنے [illegible] کی ایک جماعت سے [illegible] رہے تھے۔ [illegible] میں [illegible] ہو گیا۔ انگریز افسر [illegible] نے مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا ہے۔ نومبر ۱۸۵۵ء [illegible] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۰۳ [2] مرتب شاہ [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ جنگ و پیکار کی اجازت [illegible] بھی ہو گی جس مقصد کے لیے مولوی سید امیر علی شہید ہو گئے تھے۔

یک، مولوی احمد اللہ کی شہادت اور راجا پوائیں کو پچاس ہزار کے انعام کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے :

> برطانیہ کے اس سخت ترین دشمن کا غیر متوقع انجام سرکار کے
> تمام جاری جیوش کے مقابلے میں روہیل کھنڈ کے غدر کی جڑ
> کرنے کے لیے زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔[1]

مجمدار بالکل بجا کہتا ہے کہ احمد اللہ شاہ تمام تحسینات کا مستحق تھا تمام لیڈروں میں صرف وہ تھا جس کی اپنی کوئی غرض نہ تھی اور صرف وہ تھا جسے انگریزی حکومت کے خلاف ذاتی شکایت کوئی نہ تھی۔[2] مولانا ابوالکلام آزاد بھی یہی فرماتے ہیں کہ چند مستثنیات کے سوا سب لوگوں نے ذاتی وجوہ سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لیا۔ ان مستثنیات میں سے نہایت ممتاز دو شخص ہیں، ایک احمد اللہ اور دوسرا تانتیا ٹوپے۔[3]

آپ نے مزید فرمایا: امن فوجی قوت کے بل پر قائم نہ ہوا۔ صرف اس وجہ سے قائم ہو کر احمد اللہ شاہ کے بعد ملکی قوتوں کو منظم کر کے لڑانے والا کوئی نہ رہا۔

مولانا فضل حق

مولانا فضل حق مرحوم خیرآبادی نے بھی مولانا احمد اللہ کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں :

> اس موقع پر مستقلاً نصاریٰ کے خلاف لڑنے کے لیے ایک
> اور دست کا عامل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات و مبرات
> اور سعادات و حسنات کا خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا، وہ بڑا
> ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر، رسولِ عالم

---

۱ MAC MUIN

۲ مجمدار ص ۱۰۰

۳ مجمدار ٹاکی کی کتاب ص ۲۴۰

۴ سین کی کتاب کا پیش لفظ ص ۲۶

> اور نبی کرام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے
> لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی ہلے میں شکست دے دی[1]

اس کے بعد مولانا فضل حق، شاہ صاحب کی شہادت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ انگریز بھاگ کر ایک قصبے کے ہندو زمیندار کے مستحکم حصار میں پناہ گزیں ہوئے اور اپنے اکابر کے پاس پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ چنانچہ مدد آگئی۔ احمد اللہ شاہ سے کافر زمیندار نے داؤ کھیلا۔ قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں یعنی مجاہدین اور انگریز کے درمیان مقابلہ برپا ہوگا تو میں چار ہزار کا لشکر لے کر مجاہدین کی امداد کے لیے آجاؤں گا۔ احمد اللہ شاہ نے اس وعدے پر اعتماد کر کے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ سامنے سے نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ پیچھے سے اس غدار زمیندار نے آتشباری کی۔ اس طرح احمد اللہ شاہ نے شہادت پائی اور ان کی جماعت نے بھی سردار کے نقشِ قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔

شہادت کی سابقہ کیفیت کے مقابلے میں یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ تاہم عام روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یہ روایت صرف مولانا فضل حق کی ہے۔

مولانا کا حلیہ

میلسن نے احمد اللہ شاہ کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا قد لمبا، جسم دُبلا پتلا لیکن خوب مضبوط تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، بھویں گھنی، ناک کا بانسا اونچا اور جبڑے پتلے تھے[2] مفتی انتظام اللہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سر کے بال کالے تھے اور زلفیں دونوں کاندھوں پر لٹکتی رہتی تھیں[3]

---

[1] الثورۃ الہندیہ / باغی ہندوستان ص ۲۰۰ [2] میلسن جلد چہارم ص ۲۰۹

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۴۴

جنرل بخت خاں

ابتدائی حالات

جنرل بخت خاں کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم نہ ہو سکے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ ان کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا اور اسے نجیب الدولہ روہیلہ کے خاندان سے قرابت قریبہ تھی۔ اس خاندان پر نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں اور پوتے غلام قادر خاں دونوں کے عہد میں گردش کا دور آیا۔ یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کب، لیکن ایسے ہی کسی ناسازگار وقت میں خاندان کے افراد بکھرے تو عبداللہ خاں نے اودھ کے ایک ضلع سلطان پور میں اقامت اختیار کر لی۔

وہ بڑا وجیہہ، خوش رو تھا اور بہادری میں بھی یگانہ مانا جاتا تھا۔ غالباً انہیں اوصاف کی بنا پر شجاع الدولہ والی اودھ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہات کا مرکز بن گیا۔ شادی ہو گئی۔ اس طرح پریشان روزگار عبداللہ خاں کا رشتہ والیان اودھ کے خاندان سے استوار ہو گیا۔[1]

بخت خاں کا بیان

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ۱۱ مارچ ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱؎ حیات علامہ فضل حق خیر آبادی بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص ۵۲۹

ہوا، البتہ میرٹھ میں سپاہ کا ہنگامہ شروع ہوا تھا تو وہ بریلی میں مقیم تھا۔[۱]

ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سپاہ میں بے چینی کے آغاز پر توپ خانے کو انگریز اپنی تحویل میں لے لینا چاہتے تھے۔ جس شخص نے رد و کد احتجاجیں کیں اور بڑے بڑے افسروں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہو گئیں۔ وہ بخت خاں ہی تھا جو سرکشی کے بعد بریلی کے برگیڈ کا کمان دار بنا اور دہلی پہنچا تو اسے سپہ سالار اعظم بنا دیا گیا۔[۲]

افکار میں تبدیلی

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں کے افکار و عزائم پہلے وہ نہ تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں ہوئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے پیر مولوی سرفراز علی کے حکم کی بنا پر انگریزوں سے بیزار ہو گیا۔[۳] افسوس کہ مفتی صاحب نے اس کی تفصیل بیان نہ فرمائی، یعنی یہ کہ مولوی سرفراز علی کون تھے؟ بخت خاں نے کہاں ان کی بیعت کی؟ انھوں نے کیا حکم دیا تھا اور کیا کہ کر ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبہ بیدار کیا تھا؟

ہمیں مولوی سرفراز علی کے مفصل حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ ان کا ذکر یقیناً مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً مولوی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

> دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر، علی بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار و مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا۔[۴]

---

[۱] سیل کن جلد دوم ص ۲۰۲ [۲] ایضاً ایضاً ص ۲۰۳

[۳] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۔ [۴] سیل کن جلد سوم ص ۲۰۳

بالکل یہی مضمون حکیم احسن اللہ کے اس بیان میں درج ہے جو بہادر شاہ کے مقدمے میں دیا گیا تھا۔[1]

میرا احساس یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ لکھا حکیم احسن اللہ خاں کے بیان ہی سے ماخوذ ہے اور حکیم صاحب کا درجہ طبابت یا بعض دوسرے علوم میں کتنا ہی بلند ہو تاہم ان کی دینی معلومات بہت ہی معمولی سی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے "وہابی" کا لفظ ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا جو سید احمد شہید کے مسلک پر کاربند تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی اسلامی سرزمین کسی غیر مسلم طاقت کے قبضے میں چلی جائے تو مسلمانوں پر جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے سرگرم داعی تھے۔ اسی لیے حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا کہ بخت خاں خود "وہابی" تھا، جیسا کہ محمد غوث خاں اور مولوی [illegible] خاں "وہابی" تھے۔ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی "وہابی" تھے۔ اگر سید صاحب سے ان کا تعلق نہ تھا تو لازماً یہ ضرور ماننا چاہیے کہ وہ جہاد کو بھی نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح اسلام کے ارکان میں سے سمجھتے تھے اور اس پر عمل ضروری جانتے تھے۔ بعض بیانات میں مولوی سرفراز علی کو جونپوری بتایا گیا ہے لیکن ان کے حالات نہیں بتائے گئے۔

بریلی میں پرچم آزادی

بریلی میں بے چینی تو اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات میں ہنگامے کے آغاز کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ہنگامے کی ابتدا آتش زنی سے ہوئی۔ مختلف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں (ابن ذوالفقار خاں ابن حافظ رحمت خاں)، محمد شفیع اور بخت خاں اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۲۰۲

صبح تک پل سے بریلی کی فوج گزر سکے گی ۔ بادشاہ نے احمد قلی
خاں کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا[1]

بادشاہ سے ملاقات

۲؍ جولائی کے حالات میں مرقوم ہے کہ نواب احمد قلی خاں فوج بریلی کے استقبال کی غرض سے گئے حکیم احسن اللہ خاں، جنرل صمد خاں، ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی تھے۔ احمد قلی خاں اور بخت خاں نے بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج کو متعین کر دیا جائے۔

بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ ستایا جائے ۔ اس موقع پر فرمایا:

> میرے احکام صادر کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟ ان احکام کی تعمیل ہوتی نہیں ورنہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انھیں نافذ کر سکے میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لیے یہاں رہنے کی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ میں سپہ سالاری کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے ۔ بادشاہ نے نشان مروت کے طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات

---

[1] روزنامچے ص ۱۲۰، ۱۲۲۔ مسٹر ملس مٹکاف نے اردو روزناموں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے وقت ناموں کے متعلق متعدد مقامات پر غلطیاں کی ہیں مثلاً یہاں "محمد علی خاں" نام لکھا تھا حالانکہ نواب احمد قلی خاں تھے یعنی زینت محل کے والد اور بہادر شاہ کے خسر۔

قبول فرمالی ہیں، اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم ماننے کے لیے تیار ہے؟ سب نے بخت خاں کی اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھایا۔

منصب سالاری! پھر اس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے دروغہ رحکم دیا کہ کالا محل[1] بخت خاں کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شہزادہ میرزا مغل سے ملاقات کی:

> محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اسے تمام افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ منادی کرا دی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایت حاصل کریں۔ میرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے شہر میں لوٹ مار کی کوشش کی تو میں ان کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ بادشاہ نے فرمایا:

> تمہیں پورا اختیار ہے۔ جس کام میں بہتری نظر آئے، وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی اگر اب لوٹ مار ہوئی تو تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔[2]

بہادر شاہ کے ایک فرمان سے مترشح ہوتا ہے کہ بخت خاں کو "معز الدولہ" کا خطاب

---

[1] اصل نام مکان محل تھا اور عام لوگ اسے کالا محل کہتے تھے۔

[2] روزنامچے ص ۱۳۳، ۱۳۵

داروغہ پر ایسا ہی الزام لگا اور لوگوں نے اس کی پچاس ہزار کی جائداد لوٹ لی۔ بخت خاں کو پتہ چلا تو سپاہی اس ظلم کی روک تھام کے لیے بھیج دیے۔[1]

۵۔ بہادر شاہ کی ایک بڑی کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑے۔ اسی مصلحت کے پیشِ نظر اُس نے شہر میں ذبیحہ گاؤ بند کرایا تھا۔[2]

۶۔ بخت خاں نے مختلف راجاؤں اور والیانِ ریاست سے بھی خط و کتابت کا انتظام کیا تھا اور بعض کی عرض داشتیں اسی کے ذریعے سے دربار میں پیش ہوئی تھیں۔

اختلاف اور رقابتیں

افسوس کہ شہزادوں کو بخت خاں کی یہ کارگزاری اور یہ عزت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اُنھوں نے مختلف ذریعوں سے دراندازیاں شروع کر دیں۔ ان کے خاص کارندوں نے شکایتیں کیں کہ ہمیں بخت خاں کی قیادت منظور نہیں۔ ہم مرزا مغل ہی کو اس بڑے اعزاز کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ جب تک بخت خاں نہیں آیا تھا، انگریزوں سے روزانہ لڑائیاں ہوتی تھیں، اور جب سے بخت خاں نے دلی میں قدم رکھا ہے، لڑائیاں بالکل بند ہو گئی ہیں۔ یہ الزام سراسر غلط تھا، اس لیے کہ ابتدا میں انگریزی فوج بہت تھوڑی تھی اور اس کے پاس ساز و سامان بھی کم تھا۔ اس کے تمام مورچے بھی تیار نہ ہوئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تعداد اور ساز و سامان کی مقدار ترقی پذیر رہی۔ یقیناً انگریزوں پر حملہ جتنا آسان ابتدائی دور میں تھا، اتنا آخری دور میں نہیں رہا تھا۔ تاہم لڑائیاں برابر ہوتی رہیں۔

[1] روزنامچہ ص ۱۶۶ [2] ایضاً ص ۱۷۰

منشی جیون لال نے ۴ اگست کے حالات میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کوئی ڈیڑھ سو فوجی افسر بلائے اور ان سے کہا کہ میں نے میرزا مغل اور جنرل بخت خاں کو فوج کی قیادت کے لیے تجویز کیا ہے۔ تمھیں ان میں جو پسند ہو، اُسے منتخب کر لو۔ ہمارے لشکری ہر وقت بڑ ہانکتے رہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں لیکن لڑتے نہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ انگریز دہلی لے لیں گے اور مجھے قتل کر دیں گے۔ افسر اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں، ہم جانیں لڑا دیں گے۔ بخت خاں نے کہا اب خدا کے فضل سے میں ضرور کامیابی حاصل کروں گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ انگریزوں پر علی پور کی جانب سے حملہ کروں[1] گویا بخت خاں آخری دم تک اس کوشش میں سرگرم رہا کہ جس انگریزی فوج نے دلی کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس کا تعلق پنجاب، انبالہ اور فیروز پور سے توڑ دیا جائے۔ ۵ ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ بخت خاں میگزین کو شہر سے باہر لے جانا چاہتا تھا اور اس نے چالیس توپوں کے لیے دمدمے بنانے کا کام شروع کر رکھا تھا[2]

انتظامِ جہاد

بخت خاں کے دلی پہنچنے سے پیشتر بھی ایک مرتبہ بعض علما نے جامع مسجد میں جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ بخت خاں نے تمام علما کو جمع کر کے کہا کہ جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیں۔ چنانچہ یہ فتویٰ جاری ہوا۔ مقصود یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں مذہبی جوش پیدا ہو۔ سرسید نے لکھا ہے کہ ایسا کوئی فتوے حقیقتاً موجود نہ تھا اور بعض علماء کے دستخط بنا لیے گئے

---

[1] دو روزنامچے ص ۱۸۱

[2] ایضاً ص ۲۲۲

تھے۔ نیز جن علماء کے دستخط فتوے پر چھپے تھے، ان میں سے بعض نے انگریزوں کی جانیں بچائی ہیں[1]۔

ممکن ہے یہ رائے درست ہو، لیکن اعلان جہاد کے بعد کسی پناہ گزیں کی جان بچانا اور اس کی حفاظت کرنا عین واجب ہے، ان پر تشدد کی اجازت انھیں لوگوں سے ہے جو مسلح جنگ کریں، باقی کسی کو چھیڑنا ہرگز جائز نہیں۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ ایک فتویٰ ضرور تیار ہوا تھا۔ اسی فتویٰ تھا جس پر دستخط کرنے کے باعث مفتی صدر الدین آزردہ کی جائداد ضبط ہوئی تھی اور انھوں نے "کتبت بالخیر" کو "کتبت بالجبر" قرار دے کر جان بچائی تھی۔ اسی فتوے پر دستخط کرنے کے باعث مولانا فضل حق خیرآبادی پر مقدمہ چلا تھا۔

دہلی سے روانگی

جب انگریز دلی میں داخل ہو گئے تو از راہ دوستی بخت خاں نے اپنی فوج فراہم کی اور بادشاہ سے بہ منت کہا کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلے چلیں۔ یہ بھی کہا کہ میں دلی سے باہر تمام پوربیوں کو اکٹھا کر کے پھر انگریزوں سے لڑوں گا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بخت خاں لکھنؤ چلا گیا[2]۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ بخت خاں نے آخری دور میں دلی کے اندر فوج کی کمانداری سنبھال لی تھی۔ وہ دیانت کیش انسان تھا اور بڑے خلوص سے اصلاح کرنے کی کوششیں کیں، لیکن فوجی لیڈروں نے اسے شکست دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بخت خاں جب لڑائی کے لیے قدم اٹھاتا تو اسے بہت کم یا

---

[1] ایک انگریز عورت کی جان مولانا سید نذیر حسین مرحوم محدث دہلوی نے بچائی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کے دستخط فتوے پر ثبت تھے یا نہیں۔

[2] [illegible] ص [illegible]   [3] [illegible] جلد چہارم ص ۵۰

۵۔ [illegible] میں معلوم ہوا کہ شہزادہ فیروز شاہ میرزا محمد بیگ کے نام سے [illegible]
مکہ معظمہ چلا گیا ہے۔ یہ اطلاع اس مخبر نے دی جو شہزادے سے [illegible]

۶۔ جنوری [illegible] میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور ۱۰ دسمبر [illegible] کو [illegible]
میں پہنچ گیا۔ گویا مکہ معظمہ کی خاک پاک میں آسودگی پائی۔ بیان یہ ہے کہ [illegible]
عمر میں ایک آنکھ کی بینائی قریباً زائل ہو چکی تھی اور ایک [illegible] سے [illegible]
لگا تھا۔ شریف مکہ نے جو وظیفہ مقرر کر دیا تھا، اسی پر [illegible] رہتا تھا۔

۷۔ شہزادے کی بیوہ نے وظیفے کے لیے حکومت ہند سے درخواست کی۔ [illegible]
[illegible] میں اس کے لیے پانچ روپے ماہوار اس شرط پر مقرر ہوئے [illegible]
جائے۔ لارڈ رپن کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وظیفہ ایک سو روپے ماہوار [illegible]
دسمبر [illegible] سے پوری رقم ایک سو روپے کے حساب سے [illegible]
دلوادی۔[1]

امیر مجاہدین سے ملاقات

اوپر مذکور ہے کہ شہزادہ [illegible] میں سوات [illegible] تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سوات نہیں [illegible] تاکہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ سے ملے جو اس زمانے میں [illegible] باجکٹہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ اپریل ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے۔

کچھ معلوم نہیں کہ شہزادہ اور امیر عبداللہ کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ قیاس یہ ہے کہ شہزادہ اس خیال میں ہو گا کہ مجاہدین انگریزوں سے برسر جنگ ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کی تعداد بھی کم ہے اور ساز و سامان بھی معمولی ہے تو وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

عام طور پر مشہور تھا کہ شہزادے کی وفات ۱۸۹۵ء میں ہوئی میرے عزیز دوست

[1] سین کی کتاب ص ۲۰۱-۲۰۹

مولانا فضل حق خیرآبادی

خاندان

مولانا فضل حق ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے، جن کے علم و فضل اور یادگارات کے باعث پورے خاندان کی شہرت ہوئی۔ چنانچہ مولوی رحمٰن علی مصنف تذکرہ علمائے ہند انھیں عمری حنفی، ماتریدی اور چشتی لکھتے ہیں۔ یعنی مولانا کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ فقہی مذہب کے لحاظ سے وہ حنفی تھے، عقائد میں ماتریدی اور سلسلہ چشتیہ میں انھوں نے بیعت کی تھی۔

ان کے والد مولانا فضل امام کو دہلی میں صدر الصدور کا منصب حاصل تھا۔ والد سے تعلیم پائی۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔[1] مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے اساتذہ حدیث میں شاہ عبدالعزیز محدث کا نام گرامی بھی شامل کیا ہے۔[2] ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ حافظہ اتنا اچھا تھا کہ چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔[3]

علمی کمالات

ایک روایت ہے، جسے مولانا عبدالشاہد خاں نے درج کر دیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث کی تحفہ اثنا عشریہ شائع ہوئی

۱؎ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۶۴ ۲؎ الثورة الہندیہ ص ۲۱ ۳؎ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۶۴

ایران سے ملا باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کے لیے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے اس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ شام کے وقت مولانا فضل حق اس عالم کی خدمت میں پہنچے اور مزاج پرسی کے بعد علمی گفتگو شروع کردی پہلے افق المبین پر اعتراضات کیے، جن کا جواب ایرانی عالم نہ دے سکا۔ پھر خود ہی شافی جوابات دیے۔ آخر میں کہا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد ہوں اور کفش بردار ہوں۔ ایرانی عالم یہ کرامات دیکھ کر مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا[۱] سوچا کہ جس شخص کے شاگردوں کا یہ حال ہے، وہ خود خدا جانے کیسا ہوگا۔

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ دیکھا کہ حقہ بھی پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے، ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو افق المبین کا درس بھی دے رہے تھے اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان فرماتے جاتے تھے[۲]

درس و تدریس

اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ طالب علم سے فراغت کے بعد درس بھی دلوایا جاتا۔ اس کے بغیر حاصل کردہ علوم میں پختگی نہ آتی تھی چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام نے ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بھی آپ کے حوالے کر دیا تھا جو غالباً کند ذہن تھا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا، پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی اور درس سے اٹھوا دیا۔ وہ مولانا فضل امام کی خدمت میں پہنچا اور کیفیت عرض کی، چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستارِ فضیلت دور جا پڑی، پھر فرمایا:

تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ جس کے سامنے کتاب رکھی، اس نے خاطر داری

۱۔ الثورۃ الہندیہ ص ۲۳ ۲۲۱ ۲۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴

مولانا کی زندگی

علم و فضل میں مولانا وقت کے ممتاز ترین اصحاب میں سے تھے لیکن افکار و خیالات یا معتقدات کی بناء پر ان کی حیثیت بہت ہی معمولی تھی۔ زندگی بھی امیرانہ تھی، جسے جفاکشی یا مجاہدے سے کوئی مناسبت نہ تھی دہلی میں میرزا غالب سے گہری دوستی تھی اور میرزا کی پوری زندگی لاابالیانہ تھی۔ امتناع نظیر تو نہیں اور امکان نظیر کے بارے میں شاہ اسمٰعیل شہید سے نزاع چھیڑ دی، جو بالکل بے محل تھی۔ اس سلسلے میں مشیت و قدرت کا فرق نظر انداز کر دیا۔ بڑے نازک مزاج تھے شطرنج کا بہت شوق تھا۔ غرض ان کا عام طریقہ وہی تھا، جو اس زمانے کے امراء کا تھا اور کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آرام طلبی، تن آسانی اور امیری کے جنجال سے نکل کر آپ جفاکش مجاہدوں کے حلقے میں پہنچ جائیں گے۔

مولانا اور سیاست

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں مولانا کی ابتدائی زندگی میں کبھی بھی سیاسی امور کی طرف توجہ نہ ہوئی ان کا خاص ذوق یہ تھا کہ جہاں رہیں عزت سے رہیں۔ اچھی تنخواہ ملے، اور آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ علم کا ذوق رکھنے والوں کو درس بھی دے دیا کریں اور بس۔ چنانچہ اسی اسلوب و نہج پر ان کی زندگی گزری۔ غالباً آخری دور میں بعض دوسرے حساس و دیدہ ور اصحاب کی طرح ان پر بھی انگریزی تسلط کی خرابیاں منکشف ہوئیں۔ انھوں نے سمجھا کہ انگریز سب کو عیسائی بنا لینے کے درپے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی یہی بہترین تدبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے انگریزوں کے متعلق طبیعت میں تکدر پیدا ہوا، جو آخری دم تک بڑھتا ہی گیا۔

محرکات مخالفت

مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کے جو محرکات اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں، انھیں یہاں خلاصۃً درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں

تمہید ان دونوں بزرگوں کے حالات یک جا بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ آزادی کے جدوجہد میں ان دونوں نے اکٹھے کام کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل ایک مذہبی جدوجہد میں یہ رفیق تھے، دوسرے جنگ آزادی ناکامی پر منتج ہوئی تو دونوں یکے بعد دیگرے حجاز پہنچ گئے اور باقی زندگی اس مقدس سرزمین میں پوری کر کے مالکِ حقیقی سے جا ملے اور دونوں کے زیادہ تر حالات اسی دور کے متعلق ملتے ہیں جب انھوں نے اکٹھے کام کیا۔

مولانا رحمت اللہ مولانا کا وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، اسی لیے کیرانوی مشہور ہوئے۔ والد کا نام مولوی نجیب اللہ، جد دوم کا مسکن پانی پت تھا جہاں ان کی خاصی جائداد بھی تھی۔ یہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ ان کے جد اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰن عثمانی کازرونی بتایا گیا ہے۔ مولانا کے خاندان میں سے ایک صاحب مولانا محمد عارف الاسلام، مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کو اپنے جد دوم میں شمار کرتے ہیں۔

مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ پھر دہلی چلے گئے، جو اس زمانے میں علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں بے شمار درسی

پہلے کلکتہ کے ہسپتال میں متعین ہوئے۔ پھر انھیں آگرہ بھیج دیا گیا۔ وہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ تاج گنج کے محلہ کاغذیان میں رہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں اکبرآبادی لکھا گیا۔

یکساں ذوق اور دوستی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی کے علمی اور عملی ذوق میں یکسانی کے کئی پہلو تھے۔ مثلاً دونوں آزادی وطن کے شیدائی تھے۔ جب موقع دونوں نے جنگ میں سرگرم حصہ لیا دونوں کو عیسائیت کے مآخذ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور پادریوں کے ساتھ مناظروں میں ان کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ اس وجہ سے دونوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔

عیسائیت کی تبلیغ

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہوگیا تو ہر ملک سے عیسائی مبلغ ہندوستان پہنچ گئے اور انھوں نے جگہ جگہ مشن قائم کرلیے۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو جلد سے جلد عیسائی بنا لیا جائے تاکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہوجائیں۔ اس غرض سے چھاپے خانے قائم کرلیے گئے تھے جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے متعلق ضروری کتابیں بکثرت چھاپ چھاپ کر نشر کی جاتی تھیں اور ان کی قیمت بہت کم تھی۔ اخبار اور رسالے بھی نکلنے لگے تھے۔ لطف یہ کہ کتابیں مختلف حصص ملک کی مروجہ زبانوں میں چھاپی جاتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام پر اعتراضات بھی کیے جاتے تھے اور مناظرے بھی ہوتے تھے۔

پادری فنڈر

۱۸۴۱ء میں یورپ سے فنڈر نام ایک پادری آیا، جسے عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ وہ اردو، کثیر اسلامی کتابیں بالواسطہ یعنی ترجموں کے ذریعے سے نہیں بلکہ بلاواسطہ پڑھ چکا تھا۔ ہمارے عام علماء بیچارے سادہ سے لوگ تھے تورات، زبور اور انجیل یا عیسائیت کی دوسری کتابوں سے چنداں آگاہی نہ تھی۔ وہ

(بر صغیر ... ص ۷۲)

عیسائیوں کے اعتراضات سے واقفیت تھی۔ اس لیے وہ مناظروں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے
اور فنڈر کے متعلق مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی اس کے اعتراضات کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے عیسائیت کے متعلق ایسی معلومات
حاصل کر لی تھیں، جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں، پھر عیسائیت کی تردید اور اسلام کی
حقانیت کے اثبات میں غیر معمولی کمال بہم پہنچا لیا۔

فنڈر نے مناظرے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر وزیر خاں نے مولانا رحمت اللہ کو یہ ذمہ دیا
وہ دراصل فنڈر کو ایک مرتبہ ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ پھر اس کے لیے کہیں منہ نے
کا موقع باقی نہ رہے۔

مناظرہ

۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ/۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں مناظرے کا انتظام
ہوا چونکہ یہ بڑے معرکے کا مناظرہ تھا، اس لیے ہندوستان کے اکثر حصوں
کے علماء، امراء اور عام لوگ آگرہ پہنچے۔ بڑے بڑے انگریز افسر بھی شریک مجلس تھے۔
عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف
سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ۔ مسلمانوں کی طرف سے مناظر اول مولانا
رحمت اللہ کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں ہوئے، فیض احمد بدایونی بھی اس مناظرے
میں مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے معاون تھے۔ موضوع مناظرہ یہ تھا مسلمان ثبات
رسالت صلعم اور محفوظیت قرآن کے دلائل دیں نیز تثلیث کا ابطال کریں، اور ثابت کریں کہ
انجیل و تورات محرف ہیں۔ عیسائیوں کا موقف اس کی ضد تھا

مفتی انتظام اللہ کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں:

پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔

---

* یہ کہا جاتا ہے کہ [illegible] آگرہ گئے تھے [illegible] تیار پذیر ہوتے تھے [illegible]

> بحث و تمحیص کے بعد علانیہ سب کے سامنے پادری فنڈر کو اعلان
> کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں (انجیل و تورات) محرف ہو چکی ہیں، لیکن صرف
> مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب
> کو خود مشکوک مان رہا ہے، اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو
> سکتے ہیں۔ الغرض شکست فاش کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے
> اٹھنا پڑا اور آگرہ سے چلتا بنا[1]

غرض ہندوستان میں پادری فنڈر اور دوسرے پادریوں کو ناکام بنانے والے مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان ہی تھے۔ پھر یہ ذوق عام ہوا۔ سینکڑوں، ہزاروں مسلمانوں نے عیسائیت کی کتابوں سے گہری واقفیت حاصل کر لی اور عیسائیوں پادری مبلغوں سے مناظرے کرنے لگے۔

جنگِ آزادی

میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہوتے ہی مظفر نگر میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مختلف قصبوں میں آزادی کا پرچم بلند کر دیا تھا مثلاً تھانہ بھون، کیرانہ، شاملی، بڑھانہ وغیرہ۔ مولانا رحمت اللہ کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار تھے۔

مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی کثرت تھی اور ان کی قیادت چودھری عظیم الدین[2]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی والوں کی حمایت سے کچھ عیسائیوں نے انجیل و تورات کے کئی متعدد نسخے کھول رکھ دیئے تھے۔ اور ہر نسخے کی عبارتیں پڑھ پڑھ کر اختلافات کے ثبوت دیئے جاتے تھے، اس بحث پر سب حیران رہ گئے، پھر فنڈر کے مولانا سے خط و کتابت بھی ہوئی۔ خط و کتابت میں مولانا ہندی نے چھاپ دی تھی، مناظرہ کی روداد بھی ... نے شائع کی (جنگ آزادی ص ۲۳)

[2] معلوم ہوا کہ چودھری صاحب بھی مولانا رحمت اللہ کے ساتھ حجاز چلے گئے تھے

بنیز آتی تھیں، انھیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے:

مولوی رحمت اللہ اسی گروہ میں آ کے دہلی میں جہاد
کی صورت کیا ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے، عیسائی
مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس
مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے
نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی، بلکہ ایک
ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلے گئے[1]

غورطلب حقائق

ظاہر ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہوگا جب دہلی میں مجاہدین کی خاص تعداد مقیم تھی اور مقابلہ ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ مولانا نے اپنے ہاں جہاد کا بندوبست کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی کوشش کی کہ دہلی کے مرکز کی حالت دیکھیں، اسے ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچائیں یا باہم مشورے سے تنظیمات کا بندوبست کریں، ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ علمائے کرام کے نزدیک یہ ہنگامہ جہاد تھا، ورنہ اسے وہ نتیجہ خیز قرار دے سکتے تھے۔ وہ صحیح اصول و ضوابط کے مطابق انگریزوں سے روک کر انھیں نکالنا چاہتے تھے۔ یہ غرض نہ تھی کہ بے وجہ قتل و غارت کا طوفان اٹھائیں۔

ہجرت

مولانا نہ مل سکے تو انگریزوں نے انھیں مفرور قرار دیا اور گرفتاری کے لیے گراں قدر انعام کا اعلان کر دیا۔ اب مولانا کے لیے بچ نکلنا اور

---

[1] ذکاء اللہ، صفحہ ۳۰۔ یہ بیان درست ہے تو یقیناً اس سے مولانا رحمت اللہ کی بالغ نظری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ بھانپ چکے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے مقاصد و آداب جہاد سے کوئی مناسبت نہیں۔ بعض دوسرے بالغ نظر لوگوں کا احساس بھی یہی تھا، لیکن جنھوں نے حسب حال حصہ لیا ان کی رائے یہی تھی کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا مناسب نہ ہوگا اور اصلاح بہرحال سعی و محنت ہی کی متقاضی ہے۔

بزرگانِ دیوبند

پہلا درجہ

بزرگانِ دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ احترام و اعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ، حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی اس سرزمین کے آسمان پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں ساربانوں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستے بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے، جو دلوں اور روحوں میں دینِ حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار —— دار العلوم دیوبند —— ایسی ہے جو قریباً ایک صدی سے پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں دائروں میں قابلِ فخر ہیں۔

ان بزرگوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا تھا، افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں اور جن حضرات نے کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی، وہ بعض وقتی مصالح سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جو کچھ کہا، اس سے صورتِ حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مولانا عاشق الٰہی کا بیان

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی واقعات کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ قاضیوں کے جس خاندان کو تھانہ بھون میں رئیس اعظم کی حیثیت حاصل تھی، اس میں سے قاضی سعادت علی خاں پسر قاضی نجابت علی خاں کے دو فرزند تھے، ایک قاضی عنایت علی خاں اور دوسرے قاضی عبدالرحیم خاں۔ بڑے بھائی نے جاگیر کا پورا کام سنبھال لیا تھا۔ چھوٹا بھائی اطمینان سے امیرانہ زندگی گزار رہا تھا۔ دونوں میں باہم بے حد محبت تھی، گویا ایک دوسرے کے جاں نثار اور عاشق زار تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں ایک مرتبہ قاضی عبدالرحیم خاں چند احباب کے ساتھ ہاتھی خریدنے کی غرض سے سہارنپور گیا اور کسی سرائے میں ٹھہر گیا۔ ایک بنئے کو بیچارے عبدالرحیم سے دشمنی تھی اس نے سپنکی[1] صاحب کے پاس رپورٹ کر دی کہ دیکھیے تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہو گیا ہے اور اس کا بھائی اس غرض سے ہاتھی خریدنے آیا ہے کہ دہلی بھیجے [illegible] روڑے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

خون ناحق

یہ افواہ گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں انگریزوں نے ایک گارد عبدالرحیم خاں اور اس کے احباب کی گرفتاری کے لیے سرائے میں بھیج دی اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے جیل میں پہنچا دیا۔ بغاوت کا مقدمہ چلا اور کوئی ناصر ثبوت فراہم کیے بغیر عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت تھی، جو اس غرض سے سات ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئی تھی کہ حق و انصاف کی بخشش کا فرض انجام دے۔[2]

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

---

[1] SPANKIE صحیح نام ہے سہارنپور کا سول افسر تھا۔ مولانا عاشق الٰہی نے اسے سپنکی لکھا ہے

[2] تذکرۃ الرشید حصہ اول ص [illegible]

کی پریشانی میں گھر بار اور زندگی تباہ کر ڈالی۔

مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ اس بدامنی کے زمانے میں لوگ حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم ومغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے دینی سردار ہیں دنیاوی نظر حکومت کا بار بھی اپنے سر پر رکھیں۔ چنانچہ حضرت کو ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا چونکہ حکومت کے فیصلوں اور شرعی قضا میں مولویوں کی ضرورت تھی، اس لیے مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھانہ بھون ہی میں حضرت حاجی صاحب کے پاس ٹھہر گئے۔[1]

ایک واقعہ | مولانا عاشق علی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب مولانا رشید احمد صاحب مولانا قاسم اور حافظ ضامن کا ایک مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا:

> یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے
> سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لیے اٹل پہاڑ کی
> طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جان نثاری کے لیے تیار ہو گیا
> اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر
> کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں
> چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے
> ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں چنانچہ
> آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ
> زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔[2]

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ اول صـ۷۳ [2] ایضاً صـ۷۵

میپل نے حکم دیا تھا کہ تمام مقدمے سول افسروں کے سامنے پیش ہوں اور سزا صرف انہیں لوگوں کو دی جائے جن کے خلاف ارتکاب جرم قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ مولانا کے خلاف ثبوت کا کوئی بھی امکان نہ تھا، لہٰذا وہ سزا سے محفوظ رہے۔

"تذکرۃ الرشید" میں تین مخبروں کا ذکر جا بجا آیا ہے، جنہوں نے مولانا کے متعلق مخبری کی یعنی قاضی محبوب علی خاں تھانوی، غلام علی ساکن قصبہ علی پور، اور حکیم احمد میہ بخش رامپوری۔

ان سے جو اعلیٰ ملبوسات تقسیم کے لیے گئے تھے ، ان میں سے ایک بیش قیمت لباس بہ کمال اصرار نواب کی نذر کیا[1]

پھر شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے نواب کے لیے ایک رقم مقرر کر دی ۔ میرا خیال ہے کہ یہ انتظام نواب صدیق حسین خاں ہی کی تحریک پر ہوا ۔ معمول یہ تھا کہ نواب ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آجاتا اور عشا پڑھ کر گھر جاتا ۔

۱۸۸۲ء میں وفات پائی اور مکہ کی خاک مقدس میں آسودۂ خواب ابدی ہے ۔

نواب سخاوت حسین

معاملہ نواب تفضل حسین پر ختم نہ ہوا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کو بھی ۱۸۵۸ء ہی کے واقعات کی پاداش میں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دی ۔ منیر شکوہ آبادی نے اس حادثۂ الیمہ کی تاریخ کہی :

---

[1] "مآثر صدیقی" یعنی نواب صدیق حسن مرحوم کے سوانح جو ان کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں نے مرتب فرمائے حصہ دوم ص ۱۰۰ ، ۹۹ ۔
نواب علی حسن خاں نے خدا جانے کس وجہ سے اس واقعے کو نواب تجمل حسین خاں سے منسوب کر دیا حالانکہ وہ ۱۸۵۳ء میں وفات پا چکے تھے ۔ یہ واقعہ نواب تفضل حسین خاں کا تھا ۔ شاید مجلّہ آزادی کے فاضل مولف نے معلوم نہیں کیوں اس واقعے میں بے اصل مبالغہ ضروری تصور فرمایا یعنی کہا کہ نواب صدیق حسن خاں مکہ معظمہ پہنچے تو نواب تفضل حسین خاں بھی فقراء کی صف میں کھڑے ہوئے تھے اور شہر گداگروں کے مستحق امداد تھے ۔ نواب صدیق حسن یہ حال دیکھ کر دوڑ پڑے ، تفضل حسین کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور ایک نیا جوڑا پہنا کر دیا (ص ۲۲۰)
مآثر صدیقی میں کہیں یہ تفصیل مذکور نہیں ، صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں خود ان سے جا کر ملے اور ایک بیش قیمت پوشاک بہ کمال اصرار ان کی نذر کی ۔ بلاشبہ تفضل حسین خاں شکستہ حال و مفلس تھے لیکن ان کی غیرت کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ فقیروں کی صف میں کھڑے ہو کر مستحق امداد ہوں ۔

غازیوں کی ترکتاز

خان بہادر خان کی فوج میں ایک جیش غازیوں کا بھی تھا جو حلف اٹھا چکے تھے کہ خود مریں گے اور دشمن کو ماریں گے۔ جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، ہرگز نہ چھوڑیں گے اور نہ پیچھے ہٹیں گے۔ عین اس موقع پر اسی جیش نے حملہ کیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ لوگ بڑے وجیہ تھے۔ جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپا شروع ہو چکا تھا۔ ڈاڑھیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ سبز رنگ کی پگڑیاں اور سبز رنگ کے کمربند باندھ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، جن پر آیات منقوش تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار بجلی کی تیزی سے حملے کے لیے آئے۔ سر نیچے کر رکھے تھے اور انھیں ڈھالوں سے چھپا رکھا تھا، تلواریں بلند تھیں۔ "دین" "دین" پکار رہے تھے[1] اور اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے جہاں پنجابی سکھوں کا لشکر جما بیٹھا تھا۔ بلکہ اس سیل کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے۔ پھر غازی گھاگرا پلٹن پر جا گرے۔ میل سن کہتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی واپس نہ ہوا۔ سب نے میدان جنگ ہی میں جانیں دے دیں۔ تین غازی بریگیڈیر کیمرون[2] پر جا گرے اور اسے گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا عین وقت پر دو غازی سنگین سے شہید ہو گئے اور ایک گولی سے۔ اسی طرح بریگیڈیر والپول کی جان بڑی مشکل سے بچی[3]۔

ایک اور چال

اب بظاہر انگریزوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا تھا، لیکن یکایک کالن کیمبل نے اپنی فوج کو ٹھہر جانے کا حکم دے دیا۔ کیوں!

---

[1] انگریز مورخوں نے بار بار "دین" "دین" کے نعرے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نعرہ مروج نہ تھا۔ وہ نعرۂ تکبیر کہتے تھے۔ بعض لوگ حضرت علی مرتضیٰ کی دلاوری کے جوش اتباع میں "یا علی" بھی پکارتے تھے۔

[2] CAMERON

[3] میل سن جلد چہارم ص ۲۴۰، ۲۴۹

میں نے از خود بغاوت پر کمر نہیں باندھی۔ سرکار انگریزی میں
فوج باغی ہو گئی اور جس ملک کا جو دعوے دار تھا، اس کا
زمیں گردانا گیا۔ بریلی، شاہ جہان پور، پیلی بھیت وغیرہ یعنی
کل روہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اسی وجہ سے بخت خاں
اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھے مسند نشین ریاست کیا۔ میں نے
بلوا نہ کرایا اور نہ کسی انگریز زن و بچہ کو قتل کیا۔ جس وقت
آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا تب
میں نے قبضہ کیا۔ باقی بلوائیوں کی روک تھام اس دم میرے
اختیار میں نہ تھی، انھوں نے جو چاہا سو کیا۔

بعد ازاں لڑائیاں جا بجا سر میدان میری اور آپ کی فوج
کی البتہ ہوئیں۔ اس میں طرفین کا شکست و خون ہوا۔ اس میں میری
کیا خطا؟

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند!

اب آپ کے بس میں ہوں، جو چاہیے میری نسبت حکم دیجئے۔[1]

تبصرہ

خان بہادر خاں پر بعض انگریزوں کے قتل کا بھی الزام تھا اس کے جواب میں
انھوں نے جو کلمات عذر فرمائے تھے اور جو کچھ کہا تھا وہ یقینی اور قطعی طور پر
درست تھا یعنی نواب نے نہ کسی عورت یا بچے کو قتل کرایا، نہ کسی انگریز افسر کو بطور خود
سزائے موت دی۔ سپاہ تمام ہنگاموں میں اپنے رئیسوں اور حاکموں کی بات مانتی تھی لیکن انگریز د

---

[1] تاریخ سیرتی و مراد حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۶۳، ۲۶۴

جا کر فوت ہو گئے۔[1]

گویا نواب تفضل خاں کی حیاتِ اسیری کے قریباً پانچ سال انڈیمان میں بسر ہوئے، پھر وہ سراوک چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ صحیح تاریخِ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

جیمی گرین | اصل نام محمد علی خاں تھا کہتے ہیں کہ نواب نجیب الدولہ مرحوم کا پوتا تھا بریلی میں تعلیم پائی۔ رڑکی سے انجینئری کا امتحان پاس کیا۔ اگرچہ امتحان میں انگریزوں سے بھی زیادہ نمبر حاصل کیے تھے مگر ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ملازمت بہت معمولی ملی پھر ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو انجینئری میں معمولی حیثیت کا مالک تھا آخر استعفیٰ دے کر جیمی گرین اودھ پہنچا۔ اس زمانے میں نیپال کا مختار جنگ بہادر ولایت جا رہا تھا، اسے ایک انگریزی داں سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ محمد علی خاں کو انگریزی میں خاص کمال حاصل تھا چنانچہ مہاراجا کے ساتھ ولایت گیا دوبارہ عظیم اللہ خاں کے وفد میں شریک ہو کر ولایت کا سفر اختیار کیا کہ نانا نے پنشن کے سلسلے میں بھیجا تھا۔ عظیم اللہ خاں کے ساتھ طلبِ علم کے زمانے سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔

۱۸۵۷ء میں جیمی گرین لکھنؤ پہنچا اور وہاں حضرت محل کی حکومت میں چیف انجینئر مقرر ہوا انگریزی فوج کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر کانپور گیا۔ فوج میں پھیری کرتا ہوا گرفتار ہوا اور جاسوسی کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی۔[2] وہ عمر بھر اصل نام محمد علی خاں سے نہیں بلکہ اختیار کردہ نام جیمی گرین سے مشہور رہے۔

---

[1] تاریخ عجیب ص ۲۴۳-۲۴۴

[2] ماخوذ از "العلم" جنگ آزادی نمبر

گرفتاریاں اور سزائیں

چوتھی اور پانچویں جون کو تلاشیاں شروع ہوئیں۔ تاکہ ہنگامے کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لیے جائیں

اکتیس آدمی گرفتار ہوئے۔ ان میں پیر علی خاں بھی تھا۔ اس کے علاوہ نیز نفسیا گرفتار۔ خواجہ پٹنہ شہر کے سب سے بڑے سیٹھ لطف علی خاں کا ملازم تھا۔ اکتیس آدمیوں میں سے چودہ مجرم قرار پائے اور انھیں بے تامل موت کی سزا دے دی گئی۔ ان میں وارث علی بھی تھا جو پولیس میں جمعدار تھا اور اسے ترہٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔

بہت سے لوگوں کو قید اور تازیانے کی سزائیں دی گئیں۔ جب ٹیلر کو پٹنہ سے بدلا گیا تو اس کے جانشین نے صرف قید اور تازیانے کی سزائیں پانے والوں کے کاغذات نظامت عدالت میں بھیجے۔ غور و فکر کے بعد فیصلہ ہوا کہ گواہوں کے بیانات سزاؤں کے لیے ہرگز کافی نہ تھے۔ اس میں ٹیلر نے اندھا دھند سب کو من مانی سزائیں دلادی تھیں وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ ٹرائل اور عدالتی کارروائی کے تحت محفوظ نہ رکھے گئے۔ اگر رکھے جاتے تو پٹنہ کے اسیروں کا حشر خدا جانے کیا ہوتا۔ ٹیلر جن قیدیوں کو موت کی سزا نہ دلا سکا تھا، ان سب کو نظامت عدالت نے رہا کر دیا۔

گویا پٹنہ میں اندھا دھند تعزیر و سزا کا سلسلہ ٹیلر نے شروع کیا تھا جو کمشنر تھا اور جس کے پیش نظر اسیروں کی حفاظت تھی۔ یہی ٹیلر تھا جس نے ۱۸۶۴ء میں ان مجاہد مسلمانوں کو خوفناک سزائیں دلوائیں جو ہمارے اس [illegible] محور ہو گئے۔

میل سن لکھتا ہے کہ وارث علی کو پھانسی دینے کے لیے لے جا رہے تھے تو اس نے پکار کر کہا کہ اگر کوئی شخص شاہ دہلی کی مدد کا دم بھرنے والا موجود ہو تو سامنے آئے اور مجھے چھڑائے۔[1]

---

[1] میل سن جلد سوم ص ۲۰

کی جانیں بچائیں۔ لارڈ کیننگ نے بعد میں لکھا کہ دیوانی کے کسی افسر نے ولسن کے برابر سپاہیوں
کی جانیں دکھائیں۔[1] بعد میں وہ نیوزی لینڈ جا بسا تھا اور وہاں ایوان کے نمائندگان کا ممبر بنا رہا۔
۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔ مولانا کفایت علی کی سرگرمیوں کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے
صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ مرادآباد میں انہیں صدر الصدور بنا دیا گیا تھا اور آپ نے شرعی احکام
جاری کیے۔ آنولہ (ضلع بریلی) بھی گئے اور وہاں حکیم سعید اللہ کے پاس ٹھہرے۔ اس اثنا میں
نشر و تبلیغ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جان بچ گئی۔ کچھ معلوم نہیں کب وفات
پائی۔ ایک بیان منظر ہے کہ ان کی قبر سڑک میں آ گئی تھی۔ مولوی محمد عمر نعیمی مرادآباد کے نانا شیخ
برکت علی نے ان کی میت نکلوا کر جیل کے عقب میں دفن کرائی۔[3]

عبد الغفور خاں نساخ نے "سخن شعرا" مرتب کی تھی تو مولانا زندہ تھے۔ چنانچہ نساخ
لکھتے ہیں:

> صاحب علم و فضل و زہد و ورع ہیں۔ بیشتر شعر ان
> کے حمد و نعت میں ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی حضرت مولانا کافی کی نعتیں بڑے شوق سے سنتے تھے کہا
کرتے تھے کہ وہ سلطان نعت ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "بہار خلد" بتائی گئی ہے یعنی ترمذی کا
منظوم ترجمہ۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲ر صفر ۱۲۵۸ھ ۱۵ر اپریل ۱۸۴۲ء کا مخطوط انجمن ترقی اردو
کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ ۱۲۸۰ھ میں دوسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔
مولانا کو طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے طب کی تعلیم مولوی رحمان علی صاحب

---

[1] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی بک لینڈ [2] مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۱، ۲۲

[3] مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۲

۲۔ عبداللطیف خاں کا چچا جسے پھانسی کی سزا دی گئی۔
۳۔ اسماعیل خاں جسے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔
۴۔ مہدی بخش، اسے بھی چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔
۵۔ قاضی وزیر علی کی جائداد ضبط کرلی گئی، اس لیے کہ اس نے منصب قضا کا کام انجام دیا تھا۔

رفیقوں میں ایک لچھمن سنگھ کا نام بھی آیا ہے۔ غرض جائدادیں سب کی ضبط ہوئیں۔ مارگڑھ کا قلعہ بارود سے اڑا دیا گیا اور اس سلسلے میں ایک انگریز افسر اور کچھ سپاہی بھی مارے گئے ولی داد خاں کی جائداد بھی ضبط ہوگئی۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی

مفتی عنایت احمد، بن منشی محمد بخش، بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ۔ ان کی ولادت بہ مقام دیوہ ۹ شوال ۱۲۲۸ھ (۱۰ اکتوبر ۱۸۱۳ء) کو ہوئی۔ تحصیل علم کے لیے پہلے رام پور گئے، جہاں مولوی سید محمد علی رام پوری اور مولوی سید حیدر علی سے پڑھتے رہے۔ پھر دہلی جاکر شاہ اسحاق سے حدیث کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھ کر سند حاصل کرلی۔ بعدازاں علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی سے معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی۔ ایک سال تک مولانا بزرگ علی کے مدرسے میں مدرس رہے پھر منصف اور مفتی مقرر ہوئے۔ وہاں سے بہ حیثیت صدر امین بریلی میں تبادلہ ہوگیا۔ آخر ترقی کرکے آگرہ میں صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اسی اثناء میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ افراتفری کے باعث آگرہ نہ جاسکے، بریلی اور رام پور ہی میں قیام رہا۔ بغاوت کے اہتمام میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ملی۔[۵۸]

انڈیمان کی زندگی

انڈیمان میں ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، تاہم حافظے کی بنا پر علم صیغہ، تواریخ حبیب الہ وغیرہ کتابیں مرتب کردیں۔ پھر ایک

---

[۵۸] تیسرا التواریخ جلد دوم ص ۲۰۱

توپ خانہ بریلی پر قبضہ کیا اور علم سبز لہرا دیا۔ نواب بہادر خاں کے ساتھیوں میں ہو کر انگریزوں سے لڑتا رہا۔ آخری زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔[1]

لال بہادر خاں میواتی

اصل وطن الور تھا۔ کچھ مدت الور میں ملازم رہا، پھر سرکار انگریزی میں بھی ملازمت کی۔ اس کے رشتہ دار فتح پور سیکری میں مقیم تھے۔ جب ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے، نیمچ اور نصیر آباد کی فوجیں آگرہ پہنچیں تو لال بہادر خاں بھی ساتھ ہو گیا اور آگرہ کے قلعے تک پہنچ کر لوٹا۔ دہلی کی تسخیر کے بعد انگریزی راج کی فوج آگرہ بھیجی گئی۔ میواتیوں نے فتح پور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر انگریز کامیاب ہوئے اور میواتیوں کو بری طرح تباہ کیا گیا۔ آگرہ سے دو شالہ مراکش نے میواتیوں کی سرکردگی قبول کر لی تھی، انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی۔ لال بہادر خاں ہاتھ نہ آیا۔[2]

اصحاب پٹنہ

پٹنہ میں افراتفری کی خبریں پھیلیں تو مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ پھر ایک مجسٹریٹ مولوی مہدی کو شبہات میں گرفتار کر لیا گیا۔ وارث علی ترہٹ میں پکڑا گیا اور اس کے قبضے سے خط نکلے جنھیں باغیانہ قرار دیا گیا اور معلوم ہوا کہ پوری تحریک کی روح رواں مولوی کریم تھا جو پٹنہ سے قریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر رہتا تھا اور بڑا ذی اثر مانا جاتا تھا۔ اسے بر وقت خبر مل گئی اور گرفتار نہ ہو سکا۔ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق رہا ہو گئے۔ آخر الذکر مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ، ان کے بھائی مولانا یحییٰ اور مولانا عبدالرحیم کو ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں بجرم اعانت مجاہدین ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ وارث علی کو پٹنہ میں پھانسی دی گئی۔ پیر علی خاں لکھنوی، شیخ گھسیٹا اور رلفت

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۲۰، ۱۲۲ [2] ایضاً ص ۱۲۳

اپیل کی گئی تھی۔ بعد میں جلسے ہوتے رہے۔ ۱۶ر جولائی کو ایک بڑے ہجوم نے ریزیڈنسی پر حملے کی تیاری کی، مولوی علاؤ الدین اس کے لیڈر تھے۔ راستے میں طرہ باز خاں روہیلہ جمعدار بھی اپنے آدمیوں کو لے کر حملہ آوروں میں شریک ہو گیا۔ ریزیڈنسی سے توپیں چلنی شروع ہوئیں حملہ آور پہلے پہل ادھر اُدھر چھپ گئے، پھر منتشر ہو گئے۔ مولوی علاؤ الدین اور طرہ باز خاں کی گرفتاری کا حکم صادر ہو گیا اور وہ روپوش ہو گئے۔

۲۲ر جولائی کو طرہ باز خاں گرفتار ہوا۔ وہ بیچارا مقابلے میں سخت زخمی ہو چکا تھا۔ مقدمے میں اس کے لیے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں وہ قید سے نکل بھاگا اور جنگل میں چلا گیا۔ تعاقب کیا گیا۔ دوبارہ گرفتاری سے بچنے کی کوشش میں شہادت پائی۔ نعش حیدر آباد لائی گئی۔ بعد شہادت اس کے پاس سے دو تلواریں، ایک طپنچہ، دس روپے اور کچھ آنے برآمد ہوئے۔ شہادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ۲۴ر فروری ۱۸۵۹ء کا واقعہ تھا۔

مولوی علاؤ الدین کے لیے بھی کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ سزا کے وقت اس کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ چنانچہ وہ انڈیمان گیا اور سرسٹھ سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ گویا بتیس سال انڈیمان میں گزارے۔ بار بار رہائی کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں لیکن کوئی درخواست منظور نہ ہوئی۔ مولوی علاؤ الدین کا تعلق ایک پرانے علمی گھرانے سے تھا اور وہ خود اعلیٰ پائے کا عالم اور پرہیزگار بزرگ تھا۔

حکیم محمد عبدالحق

حکیم محمد عبد الحق بن محمد حسن بخش، اصل وطن دہلی تھا۔ مدت تک راجہ ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ کے ایجنٹ رہے[1]۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں کہ بلبھ گڑھ میں دیوانی پر مامور تھے، خوب روپیہ پیدا کیا اور مالدار ہو گئے۔ پھر

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۳۷

ملازمت سے مستعفی ہو کر گھر آگئے۔ چونکہ میرزا احمد اور جے سنگھ راؤ کے نوکروں کی وجہ سے نواب حامد علی خاں کے ہاں آنا جانا تھا۔ اس لیے پھانسی دی گئی

میرٹھی ریکارڈس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکیم صاحب بہادر شاہ کے ایڈیکانگ بن گئے تھے۔ ان کے ماتحت چار سو سواروں اور پیادوں کا لشکر تھا۔ جو انگریزی فوج سے لڑا ان میں سے دس بارہ مقتول و مجروح ہوئے۔ اس فوج میں حکیم صاحب کا ایک عزیز اکبر علی جمعدار تھا۔ وہ بھی زخمی ہوا تھا اور زخموں کی وجہ سے وفات پائی[۱]

حکیم صاحب باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے جو جنگ کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ ضلع گڑگانوہ کا انتظام ان کے سپرد تھا[۲]

بہادر شاہ کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا بلبھ گڑھ نے ۲۲ راگست ۱۸۵۷ء کو ایک عرضی دی تھی۔ جس میں مختلف آدمیوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپیہ لے کر دہلی چلے گئے۔ اس میں حکیم عبدالحق کے خلاف دس لاکھ روپے کا الزام لگایا گیا تھا[۳] ایک مقام پر ذکر ہے کہ حکیم صاحب دربار میں آئے اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے[۴]

ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی[۵]

جنرل نیاز محمد خاں

یہ بھی بڑے مجاہدوں میں سے تھا۔ خوب لڑتا رہا۔ آخری شکست کے بعد کر سنلہ چلا گیا تھا۔ کئی سال وہاں گزارے پھر ہندوستان آیا تو نواب جوناگڑھ کے پاس ملازم ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء میں یہ بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں پہچان لیا گیا۔ گرفتار ہوا اور مقدمہ چلا جس میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ ہائی کورٹ نے سزائے موت کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا۔ انڈمان ہی کی آغوش میں آسودہ ہے۔

---

۱ میرٹھی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۲۶۲ ۲ جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۲۶۲

۳ بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۴۶ ۴ ایضاً صفحہ ۱۰۴

۵ میرٹھی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ اول صفحہ ۲۶۲